ڈاکٹر شازیہ عنبرین

ازدواجی محبت کے نمائندہ چند خطوط کے مجموعے: ایک محاکمہ

دُنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اُردو زبان وادب میں بھی خودنوشتہ سوانح کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اِن میں ایسے مرقع بھی ہیں جن کے لکھنے والوں کی راست گوئی تمام شبہات سے بالا ہے لیکن اِن میں سے بیشتر اس گمان کے ساتھ نہیں بلکہ اس یقین کی بنا پر تخلیق کیے گئے ہیں کہ انھیں منظرِ عام پر آنا ہے اور ایک مرتبہ شائع ہو جانے کے بعد اِن کے کسی نقش کو مٹایا بھی نہیں جا سکے گا لہٰذا یہ دعویٰ کرنا بے حد مشکل ہے کہ ایسے احساس نے لکھنے والوں کے قلم کو محتاط روش اپنانے پر مجبور نہیں کیا ہوگا۔ نگارش کے ذخیروں میں سے صرف ایک صنف ایسی ہے جس میں تکلف اور مبالغے کی گنجائش کم سے کم ہوتی ہے یعنی مشاہیر علم و ادب کے خطوط و مکاتیب جو اُنھوں نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور نیازمندوں کو لکھے اِن کا سرمایہ ہر زبان کے ادبیات میں بڑا گراں قدر اور بیش بہا سمجھا جاتا ہے۔ اُردو زبان وادب کا دامن بھی اِس خزانے سے مالا مال ہے۔ خط بنیادی طور پر دو انسانوں کے وجود کا طالب ہوتا ہے اِس میں غیبیت یا رازیت کا ایک سحر انگیز ماحول بھی شامل ہوتا ہے اور ایک طرح کی سوشل اپیل بھی۔ اگر مکتوب نگار کو مناسب فضا مل جائے تو اِس کے لکھے مکتوب ایک پُرمسرت اجتماعی نظام یا ادارہ بن سکتے ہیں۔ جن مکتوب نگاروں میں اِس فضا کے پیدا کرنے اور باقی رکھنے کی استعداد زیادہ ہوتی ہے اِن کے خطوط وسیع تر مطالعہ کے وقت زیادہ خوشگوار اور پر تاثیر بن جاتے ہیں۔

عام خیال یہ ہے کہ اُردو میں خطوط نویسی کی ابتدا مرزا غالب کے خطوط سے ہوئی جو درست نہیں۔ غالب سے پہلے 'فسانہ عجائب' کے مصنف رجب علی بیگ سرور کے خطوط بھی شائع ہو چکے تھے۔ لیکن اُردو مکتوب نگاری میں نئی طرز کی ایجاد کا سہرا صحیح معنوں میں مرزا غالب کے سر ہے۔ غالب سے پہلے خطوط میں خلوت کی زندگی کے اشارات آتے بھی تھے تو علامت اور استعارے کی زبان میں آتے تھے۔ اِس کے باوجود ایسے خط شاید ہی کبھی محفوظ رکھے گئے ہونگے جن میں کسی کی نجی زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہوگا جو قابلِ اخفا ہو۔ مرزا غالب نے اِس رسم کو ترک کر کے اپنی زندگی میں ہی اپنے خطوط شائع ہوتے دیکھے اور ان میں دلچسپی بھی لی۔ یہ وہ خط تھے جن میں ذاتی معلومات اور عام مطالب کے علاوہ اِن کی زندگی کے ہر قسم کے حالات ملتے ہیں یہاں تک کہ اِن کی مے نوشی اور عشق بازی کے تذکرے بھی آتے ہیں۔

غالب کے بعد تو گویا ادیبوں اور شاعروں کے خطوط کے مجموعوں کا تانتا بندھ گیا۔ اِن میں سے اکثر مجموعوں کی علمی اور ادبی حیثیت کمزور ہو سکتی ہے لیکن وہ اپنے زمانے کی ادبی تاریخ اور سماجی حالات کا مفید مرقع ضرور ثابت ہوئے۔

جنگ عظیم اوّل کے بعد ذہن وفکر نے جو نئے انقلاب قبول کیے اِن سے مکتوب نگاری بھی متاثر ہوئی۔ اِس زمانے میں سرسیّد کے دور کی کلاسیکی، منطقی اور افادی روح کے خلاف ایک جذباتی اور رومانی ردِعمل ہوا۔ اِس کے بڑے علمبردار ابوالکلام آزاد اور اقبال تھے۔ اِس قافلے میں جدا جدا حیثیتوں سے مہدی افادی، نیاز فتح پوری، سیّد سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی،

رشید احمد صدیقی اور کئی دوسرے اہلِ قلم بھی شامل ہوتے گئے۔ البتہ علی گڑھ تحریک کا رنگ بھی کہیں کہیں جھلک دکھاتا رہا۔ جس کے ایک بڑے نمائندہ مولوی عبدالحق تھے۔

۱۹۳۶ء کے بعد اُردو شعر و ادب میں حقیقت نگاری اور نفسیات کے مطالعے کا جو ذوق بیدار ہوا اِس کے زیرِ اثر مکتوب نگاری کے آداب و رسوم نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ اِس نئے ماحول میں جن لوگوں کے خط منظرِ عام پر آئے اِن میں واقعیت کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا اور خود کو چھپانے کا جو انداز اِس سے پہلے خطوں میں چلا آتا تھا اب وہ ترک ہوتا گیا اور صاف گوئی کا میلان عام ہونے لگا۔ یہ صاف گوئی رفتہ رفتہ بغاوت اور بے باکی میں ڈھلنے لگی۔

اس دور کے خطوط میں اِس زمانے کی افراتفری اور پریشانی طبع کے نقوش موجود ہیں۔ عام طور پر اِن خطوط میں نظم اور اہتمام کی تو کمی ہے اور ادبیت کے لحاظ سے کوئی خاص کشش بھی نظر نہیں آتی مگر واقعیت نگاری اور حقیقت پسندی کے غلبے نے مکاتیب نگاری پر خاص اثر کیا لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خطوط کے ذریعے نہ صرف کسی بھی عہد کے شاعر یا ادیب کے باطن میں جھانکا جاسکتا ہے بلکہ اِس عہد کے ادبی منظرنامے کے ساتھ ساتھ اِس دور کے سماجی مراحل اور ثقافتی یلغار تک رسائی بھی ممکن ہے۔

سیاسی، دفتری، تجارتی، کاروباری، اطلاعاتی، علمی، معلوماتی، شخصی اور خیالی، خطوط کے ساتھ ساتھ اِس دور کی مکتوب نگاری میں ایک طرز جو بہت مقبول ہوئی وہ اِن رومانوی خطوط کی تھی جو شعر و ادب کی دُنیا کے معروف مثالی جوڑوں نے ایک دوسرے کو لکھے۔ بیویوں کے شوہروں کے نام اور شوہروں کے بیویوں کے نام خط لکھنا کوئی نئی بات نہیں مگر ان خطوط کی اشاعت یقیناً نئی بات تھی۔ سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد، سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد، کرسٹابیل (بلقیس) اور ڈاکٹر ایم ڈی۔ تاثیر، فیض احمد فیض اور ایلس فیض (کلثوم)، منٹو اور صفیہ، جاں نثار اختر اور صفیہ اختر، کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی، اِس دور کے ایسے محبت کرنے والے مثالی جوڑے تھے جن کی محبت 'پاکباز' بھی تھی اور 'شرعی' بھی۔ اِس زمانے کے نوجوان خاص طور پر کالج کے لڑکے لڑکیاں اِن لوگوں کو اپنا ہیرو سمجھتے تھے اِن حالات میں جب اِن مشاہیر کے خطوط شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے تو اِنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کو سمجھنے یا ماننے والے ازدواجی یا گھریلو زندگی کی پاکیزگی کا احترام نہیں کرتے اور ازدواجی رشتے کی طہارت، اِس کی بلند قدروں، اِس کی درخشندہ ذمہ داریوں کے ڈرامائی چیلنج کو نہیں سمجھتے اِن کی غلط فہمی اِن خطوط کے مطالعے سے یقیناً دور ہوسکتی ہے۔ حالانکہ بیگمات اور محبوباؤں کے نام خط اُن سے پہلے بھی لکھے گئے مثلاً واجد علی شاہ کے خطوط اپنی بیگمات کے نام اور شبلی نعمانی اور علامہ محمد اقبال کے خط، عطیہ فیضی کے نام۔ لیکن یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ محض عاشقانہ جذبات کے اظہار سے کوئی خط اعلیٰ خط نہیں بن سکتا اگر محض عاشقانہ فریاد ہی کسی خط کے عمدہ ہونے کی علامت ہوتی تو پھر ہر عاشق کا ہر خط ایک صحیفہ فائقہ بن سکنے کا مستحق قرار پاتا۔ اردو کے ناصح نقاد ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے بقول:

> ''جو شے خط کی لطافت کو سخت نقصان پہنچاتی ہے وہ ہے جذباتیت کا اظہار۔ اِسی وجہ سے نوجوان خط نگاروں کے عاشقانہ خط فنی رتبہ حاصل نہیں کرپاتے۔''[۲]

شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) نے جو خطوط بمبئی کے ایک علم دوست خاندان کی دو تعلیم یافتہ خواتین زہرا بیگم فیضی اور عطیہ بیگم فیضی کے نام لکھے وہ خطوط عاشقانہ بھی ہیں اور قدرے جذباتی بھی۔ مگر شبلی کے لہجے اور اِن کی شخصیت کے بھرپور رس نے اِن خطوط کو رسیلا بنا دیا ہے۔ اِس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ شبلی مکتوب میں توازن اور لطافت کے اُصول سے اچھی طرح

باخبر تھے اور غالب کی طرح ہجر میں وصل کے مزے لینے کی استعداد سے بھی بہرہ مند تھے۔

"قرۃ عینی! تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگا لیا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔ افسوس دیر تک ملنے کی اُمید نہیں۔ میں وطن، احباب، آرام سب چھوڑ سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی اور قومی کام کیونکر چھوڑ دوں؟ ورنہ بمبئی یا جزیرہ دو قدم پر تھے زہرا صاحب نے تھوڑی ردوکد کے بعد منظور کر لیا کہ پھر کبھی لکھنو آئیں لیکن تم اتنی غریب نوازی کیوں کرو گی؟"[۳]

سجاد ظہیر (۱۹۱۴ء-۱۹۷۳ء) کے خطوط کا مجموعہ "نقوشِ زنداں" ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ اِس مجموعے میں سجاد ظہیر کے وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے اپنی محبوب بیوی رضیہ سجاد (۱۹۱۷ء-۱۹۷۹ء)[۴] کے نام سنٹرل جیل لکھنو سے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء کے درمیان لکھے:

رضیہ سجاد ظہیر لکھتی ہیں:

"میں نے اپنے رفیق اور شوہر سجاد ظہیر کے ساتھ ۳۵ سال گزارے اور یہ کہنے کے ساتھ میں سوچتی ہوں کہ ہماری زندگی میں لفظ 'ساتھ' کے کیا معنی تھے؟ ہماری شادی ۱۰ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو ہوئی ۱۲ر مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ گرفتار ہوئے، دو سال قید رہے ۱۹۴۸ء کے اپریل میں پاکستان گئے ۱۹۵۵ء کی جولائی میں واپس آئے۔ ۱۹۴۷ء سے پارٹی کا اخبار نکالنے دہلی آ گئے۔ میں بچیوں کی تعلیم کی وجہ سے لکھنؤ میں رہی۔ ۱۹۶۵ء میں مَیں بھی دہلی آ گئی۔ تب سے ہم دونوں یہیں رہے۔ اِس طرح ہم تقریباً دس سال تو ایک دوسرے سے بالکل الگ رہے۔ آٹھ سال کبھی کبھار ملتے تھے۔ تقریباً آدھی مشترکہ زندگی الگ الگ رہ کر خطوں پر بسر ہوئی۔ پھر بھی ہمیں ایک ایسی رفاقت نصیب رہی جو کم میاں بیوی کو ملتی ہے۔"[۵]

رشتہ ازدواج ایک خوبصورت رشتہ ہے تاہم اِس رشتے کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اِس رشتے میں بندھتے ہی عورت کا حسن اپنی آب و تاب کھونے لگتا ہے۔ شادی کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والا رومان عملی زندگی کی کڑی دھوپ میں بہت جلد اپنا رنگ روپ بدلنے لگتا ہے۔ عورت کو حریم ناز سے نکل کر باورچی خانے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ رشتہ ازدواج کے زیر اثر شوہر کا اپنی بیگم کے متعلق احساس ملکیت عورت کی دلکشی کو بے کشش اور بے وقعت اشیاء کے زمرے میں لے آتا ہے لیکن ہر کلیے میں ایک استثناء پایا جاتا ہے اور 'نقوشِ زنداں' میں موجود خطوط اِس کلیے میں استثناء کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ اِن خطوط میں وہ سب کچھ ہے جو عاشق و معشوق کے خطوط میں ہوا کرتا ہے۔

"میں تین دن بہت پریشان رہا اِس لیے کہ آپ کی خفگیوں کے مجھے بہت تلخ تجربات ہیں اور اب تو یہ حالت ہے کہ......

ہم خستہ تن ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں دم نکل گیا

پڑا پڑا سوچتا رہا کہ جب آپ نے محض ایک لفظ کہنے پر لڑائی کی ٹھان لی ہے تو معلوم نہیں دل میں کیا

ارادے ہیں اور اگر کہیں میں عاجز اور لاچار ہو کر کہنے لگتا کہ ؎

سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیسی دلربا تم ہو
قیامت ہو، غضب ہو، قہر ہو، آفت ہو کیا تم ہو

؎ اِس بلائے جان سے آتش دیکھئے کیوں کر بنے ____ تو پھر تو گویا کہ وہ آتش فشاں کے دھارے پھوٹ بہتے اور میں آپ کا ناچیز پرستار جاں بحق تسلیم ہو جاتا۔ اچھا اب آپ میری خطا معاف کیجئے، میں جھوٹا، میرے وعدے بھی سراسر جھوٹے۔ تم ہی سچے سہی، اس بات کا جھگڑا کیا ہے؟'' (۱۵ر ستمبر ۱۹۴۱ء، سنٹرل جیل لکھنو)٦

''میری جان! بلکہ جان سے بھی زیادہ پیاری بیوی، جلد آؤ، جلدی آؤ، اور اپنے ساتھ اس منی سی پری کو بھی لاؤ۔ جو میرے دل کا سرور ہے اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تا کہ اِس کے بڑے بڑے کان اور اِس کی آنکھیں اور اس کے منے منے ہاتھ پاؤں کو دیکھوں اور اِس کی غوں غاں سنوں؟'' (۱۵ر ستمبر ۱۹۴۱ء)۷

''او میری جان، میری پیاری شریر، نمکین معشوقہ، کیسی ہو؟ بہت تھکی، دردمند، نجمہ کی تیمارداری کی وجہ سے محروم خواب۔ آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔ تمہیں سو ہزار بار پیار کروں۔'' (یکم ستمبر ۱۹۴۱ء)۸

''نقوشِ زنداں'' میں ان تنہائیوں کی یاد ہے جن میں سجاد ظہیر اپنی سخت جاں سیاسی زندگی کے باوجود محبت کی دوری کو محسوس کر رہے ہیں۔ یہ خطوط واقعیت اور خلوص سے لبریز ہیں۔ اِن میں کوئی تصنع اور بناوٹ نہیں بلکہ بے تکلف لہجے میں گفتگو ہے۔ اِن خطوط میں ایک گھریلو ماحول ملتا ہے شادی کے اوّلین دنوں کی یادیں ہیں۔ بچوں کی قلقاریاں ہیں، زندان کی تنہائیاں ہیں، ہجر کی سختیاں ہیں۔ وصل کی اُمیدیں ہیں، معاشرتی تلخیاں، معاشی مجبوریاں ہیں، شعروادب کی چاشنیاں ہیں، سیاست، سماج اور تنظیم کی نیرنگیاں ہیں۔

''میری بہت پیاری بیوی! کیسی ہو تم اور نجمہ بیگم؟ بہت دنوں بعد تمہاری خیرت معلوم ہوئی اور اطمینان ہوا۔ اب تو تمہارے امتحان کے دِن قریب آتے جاتے ہیں اِس لیے پڑھنے میں زیادہ مشغول ہونا ہی ہوگا۔ یہ وقت کاٹنے کا ایک ذریعہ سمجھو اور تنہائی کا شغل۔'' (۳۱ر جنوری ۱۹۴۱ء)۹

''اب میں اپنی کتاب کا دسواں باب لکھ رہا ہوں۔ بہت سی رکاوٹوں اور کتابوں کی کمی کے باوجود سوچتا ہوں کہ جیسے تیسے اِسے جلدی ختم کرلوں، کاش کہ تم اسے پڑھ کر اپنی رائے دے سکتیں۔ تمہاری ہی ترغیب اور رائے سے میں نے اسے لکھنا شروع کیا تھا۔'' (۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۳ء)۱۰

اِن خطوط میں مکتوب نگار کے اپنے ہی جذبات کا اظہار نہیں ہے بلکہ مکتوب الیہ کے جذبات کا جواب اور ردِ عمل بھی ہے۔ اِن خطوط میں ترازو کے دونوں پلڑے برابر نظر آتے ہیں یعنی مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کی جیتی جاگتی تصویریں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اِن خطوط میں صاف گوئی اور بے تکلفی ہے مگر بے باکی نہیں۔ بلکہ وقار، ٹھہراؤ اور تہذیب سب کچھ ہے مگر خشکی نہیں۔ زندگی کی حرارت اور سچی محبت کی متانت ان خطوط میں ہر طرف جلوہ گر ہے۔ جوش ملیح آبادی کے نزدیک:

''اِن خطوں میں وہ سب کچھ ہے جو عاشق و معشوق کے خطوں میں ہوا کرتا ہے۔ اِن میں وہ حرارت، وہ ہلچل، وہ ہم ہمہ اور وہ حیات پائی جاتی ہے جو ازدواج کے مرطوب صحن میں نہیں۔ معاشقے کے مہکتے سبزہ زاروں میں پائی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں اگر اِن بزرگوار کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو اپنے خطوں میں نہ جانے کیا قیامت برپا کر دیتے؟ روشنائی سے نہیں بلکہ قلم کو خونِ دل میں ڈبو کر خامہ فرسائی کرتے۔''[۱۱]

۲۰۰۶ء میں سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد کی سب سے چھوٹی بیٹی نور سجاد ظہیر نے اپنی یادداشتوں کو 'میرے حصے کی روشنائی' کے نام سے لکھا۔ یہ کتاب دراصل سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر کی کہانی ہے۔ حوضِ خاص دہلی کے ایک ایسے گھر کی کہانی جس میں باہر اندر کا بھید نہیں ہے۔ گھر میں روز محفل اور محفل میں شامل پورا گھر۔ گھر میں بالکل الگ طبیعت کے دو قریب رشتے، دونوں ادیب اور ایک دوسرے کے عاشق زار۔ اِس گھر میں رہنے والے بچوں کو اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دو عاشقوں کے بیچ بلاوجہ اپنے لیے جگہ بنا رہے ہوں۔

''امی اور ابا نے تو ایک دوسرے کو شادی سے پہلے دیکھا تک نہیں تھا عمر کا بھی کافی بڑا فرق تھا۔ خاندانوں کی تہذیب ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی پھر کیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں اِس قدر مبتلا ہو گئے کہ اِن کی لڑکیاں جو اِس عشق کا جیتا جاگتا ثبوت تھیں اِس عشق کے دائرے سے اکثر خود کو باہر پاتی تھیں۔''[۱۲]

ایامِ اسیری کے دوران لکھے گئے خطوط کا ایک اور مجموعہ ''صلیبیں میرے دریچے میں'' ہے:

گڑی ہیں کتنی صلیبیں میرے دریچے میں

ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں کسی پہ قتل مہِ تاب ناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سر مست شاخسار دونیم کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں
اور آئے دِن میری نظروں کے سامنے اِن کے شہیدِ جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

(دریچہ از زندان نامہ)[۱۳]

اِس مجموعے میں شامل خطوط فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء) نے اپنی اہلیہ ایلس فیض (۱۹۱۵-۲۰۰۳)[۱۴] کے نام ۱۹۵۱-۱۹۵۳ء میں چار سالہ دورانِ اسیری لکھے جو بیس سال بعد ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئے یہ کل ۱۳۵ خطوط ہیں۔ جن میں ایک پوری دُنیا آباد ہے۔

''سالگرہ مبارک اور تمہیں ایسے بہت سے دِن دیکھنے نصیب ہوں اب کے یہ دن خوشی کا دن نہیں تھا لیکن جو کچھ ہم پہ گذری اِس کے سبب سے آئندہ ایسے سب دن پہلے سے زیادہ بھرپور اور بیش قیمت ہوں گے۔ شاید 'ہم پہ گذری' کے بجائے 'جو کچھ تم پر گذری ہے' لکھنا چاہیے اِس لیے کہ مجھ پر تو کچھ

ایسی نہیں گذری صرف یہ خیال آتا ہے کہ جس کی خاطر تم نے اتنا دُکھ سہا اسے ہم سے بہتر کوئی شے ہونا چاہیے تھا اور جو قیمت تم نے اس رفاقت کی ادا کی ہے اِس کا کچھ بہتر معاوضہ دیا جانا چاہیے تھا۔'' (۲۴ر ستمبر ۱۹۵۱ء) ۱۵

''تم نے پوچھا ہے کہ تمہارے لیے ساتھ کیا لاؤں؟ تم خود آ جاؤ اور ان دو ہنستے ہوئے چہروں کو ساتھ لیتی آؤ۔ اِس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیے؟'' (۲۴ر ستمبر ۱۹۵۱ء) ۱۶

''یہاں رنج کی بات صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ریت اور مٹی کی وجہ سے سب لوگ گنجے ہوتے جا رہے ہیں مجھے ڈر ہے کہ یہاں سے باہر آنے تک ہماری سب 'سیکس اپیل' ختم ہو چکی ہوگی یہ بہت المناک واقعہ ہوگا اِس کے بعد ہم پر تہمتیں تراشنے والے بیچارے کیا کریں گے؟ آخر ایک بوڑھے گنجے بزرگ کے بارے میں کوئی کیا سکینڈل ایجاد کر سکتا ہے؟'' (۱۸ر اگست ۱۹۵۱ء) ۱۷

''لاہور کا درجۂ حرارت اخبار میں دیکھتا ہوں تو دل دُکھتا ہے پھر میں تصور کرتا ہوں کہ تنور کے سے دفتر میں تمہارا پسینہ بہہ رہا ہوگا۔ بچے دوپہر کی دھوپ میں پیدل گھر آ رہے ہوں گے اور لمبی تپتی ہوئی شامیں ایک بوجھ کی طرح تن بدن کو کچل رہی ہوں گی۔ مجھے ان سب تقاضوں کا احساس ہے جو تمہاری اکیلی جان سے کیے جا رہے ہیں۔ جن سے نہ نجات کی کوئی صورت ہے اور نہ آرام جسم و جاں کی۔'' (۲ر جون ۱۹۵۲ء) ۱۸

محبت، حسن، زندگی، شکایتیں، حکایتیں، دلداریاں، خود بینی، خود فراموشی، مطالعہ میں شرکت کی تمنا، شاعری، ادیبوں اور ادب پاروں پر فیض کے تبصرے، فیض کا فلسفہ زندگی، ایلس سے فیض کی محبت، ان کے لیے احسان مندی کے جذبات، حوصلہ افزائی کا انداز، بچوں سے محبت اور وابستگی کا اظہار۔ عید اور کرسمس کی پارٹیاں، مشاعرے درسِ قرآن کے ساتھ ساتھ درسِ شیکسپیئر اور درسِ غالب کا اہتمام، مداحوں کا خلوص، پرانی یادیں اور نئے ادبی منصوبے، زندگی کی جدوجہد میں بشاشت اور خوش طبعی، غرض ایک جیتی جاگتی زندگی خطوط کے اِس مجموعے میں کروٹیں لیتی محسوس ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ رضیہ سجاد ظہیر اور ایلس فیض کا شمار معاشرے کی اُن پڑھی لکھی خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے نہ صرف گھر کے اندر کی ذمہ داریاں نبھائیں بلکہ گھر کے باہر کی تمام ذمہ داریاں بھی اپنے رفیقانِ حیات کی غیر موجودگی میں انھی کے نازک شانوں پر تھیں۔ انھوں نے کالج میں پڑھایا، دفتروں میں نوکریاں کیں۔ تراجم کا کام کیا۔ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم کے ساتھ ساتھ بہترین تربیت بھی دی۔ ایامِ اسیری میں قیدِ تنہائی کاٹتے اپنے شوہروں کا حوصلہ بھی بلند کیا اور اِنھیں ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اِن کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں معاونت بھی کی۔ علمی و ادبی کتب اور رسائل کی فراہمی کا سلسلہ ہو یا نئی کتب لکھنے کی ترغیب و ہمت دینا ہو یہ خواتین ہر قدم پر اپنے پتی دیو کے ساتھ موجود رہیں۔ انھوں نے اپنے جیون ساتھیوں کو صرف معاشرتی، معاشی، جذباتی، رفاقت کا احساس ہی نہیں دیا بلکہ اِن کی ذہنی رفیق بھی بنیں۔ محبت و رفاقت کے ساتھ ساتھ یہ زوجین کی ذہنی ہم آہنگی بھی تھی۔ جس کی بدولت انھوں نے کامیاب ازدواجی زندگی بسر کی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ شوہر حضرات اپنی بیگمات کے عزم و حوصلے سے گھبرانے لگے کہ کہیں وہ زندگی کی دوڑ میں انھیں پیچھے ہی نہ چھوڑ دیں۔

''بنے اور میں دونوں اِس خیال سے کچھ گھبرانے لگے ہیں کہ جیل سے باہر آنے تک ہماری بیویاں ہم سے آگے نہ نکل جائیں۔ کچھ دن ہوئے رضیہ کا ایک خط آیا جو سراسر شعر معلوم ہوتا ہے لکھا تھا۔'' کسی دن جب آنے والی نسلیں تم لوگوں کی باتیں کریں گی تو نہ جانے انھیں کبھی میرا اور ایلس کا بھی خیال آئے گا؟ ہم نے پورا راستہ تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تم ایک قدم آگے اور ہم ایک قدم پیچھے۔ تم مڑ مڑ کر تسلی کے لیے ہماری طرف دیکھتے رہے اور ہم جواب میں تمہاری طرف مسکراتے رہے۔ اگرچہ ہمارے دل درد سے چلا رہے تھے۔''[۱۹]

رضیہ سجاد ظہیر اور ایلس فیض کے ساتھ ساتھ دُنیائے ادب کے درخشاں ستاروں میں دو ہم نام خواتین ایسی بھی ہیں جنھوں نے اپنے شاعر جیون ساتھیوں کو زندگی بھر نہ صرف بھرپور محبت دی بلکہ ہر مشکل وقت میں اِن کے ساتھ قدم سے قدم ملاتی چلتی رہیں لیکن نہ صرف دونوں کے نام ایک جیسے تھے بلکہ اِن کی زندگی اور اِن کی مقدر بھی کاتب تقدیر نے ایک جیسے لکھے تھے۔ سجاد ظہیر اور فیض نے اپنی محبوب بیویوں کو راہِ حیات میں تنہا کرنے میں پہل کی جب کہ اِن دو ہم نام خواتین نے دُنیا چھوڑنے میں پہل کی اور دونوں خواتین کے عاشق زار ہمسفر دوسری شادی کرنے پر مجبور ہوئے۔

میری مراد صفیہ اختر اور صفیہ راشد سے ہے صفیہ اختر کے جاں نثار اختر کو لکھے گئے خطوط کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ ''حرفِ آشنا'' (۱۹۷۳ء)، جس میں اکتوبر ۱۹۴۳ء سے نومبر ۱۹۴۷ء تک کے لکھے ہوئے خطوط شامل ہیں۔''زیرِ لب'' (۱۹۵۴ء) میں ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء سے ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۲ء تک کے لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ ہے۔

گھر آنگن، کے شاعر جاں نثار اختر (۱۹۱۴ء-۱۹۷۶ء) نے اپنی شاعری میں ازدواجی زندگی کے سکھ، دُکھ، باہمی رفاقت، پیار اور محبت کے سوز و گداز کو موضوع بنایا ہے۔ بیشتر افسانہ نگار اور ناول نگار جہاں اپنی کہانی ختم کر دیتے ہیں جاں نثار اختر کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ وہاں سے ابتدا کرتے ہیں۔ اردو میں گھر آنگن کی شاعری کا سرمایہ بہت کم ہے لیکن یہ کلیہ صرف اردو زبان تک ہی محدود نہیں بلکہ دُنیا کی ہر زبان کی شاعری گھر سے باہر کی شاعری ہی رہی ہے۔ البتہ سنسکرت اور اِس سے متاثر ہونے والی ہندوستانی زبانوں کی لوک شاعری میں گھر، گھر کی عورت اور اس کے اردگرد کے رچے بسے ماحول کی عکاسی، نازک ترین جذبات کے ساتھ کی گئی ہے۔ اِس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بیشتر لوک گیت عورتوں کی تخلیق ہیں۔ اِس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مردوں کی زندگی اکثر و بیشتر گھر سے باہر کی زندگی رہی ہے اور گھر غاروں کے زمانے سے آج کے جدید دور تک عورت اور اُس کی ذات کا مرکز و محور رہا ہے۔ 'گھر آنگن' جہاں میاں بیوی دُکھ سکھ بانٹ کر جیتے ہیں۔ دُنیا کی مشکلات کا، مہنگائی کا، آمدنی کی کمی کا اور دوسری ضروریاتِ زندگی کی کمیابی کا مقابلہ کرتے ہیں اور پھر بھی محبت کو برقرار رکھتے ہیں جاں نثار اختر کی شاعری گھر آنگن کے انھی تجربات کے تانے بانے میں مرد کے مشاہدات اور عورت کے احساسات کی ترجمان ہے۔

کھلتے ہوئے ہونٹ مسکراتی آنکھیں
عورت کا نہیں اِس سے حسیں کوئی سنگھار

پانی کبھی دے رہی ہے پھلواری میں
کپڑے کبھی رکھ رہی ہے الماری میں

تو کتنی گھریلو سی نظر آتی ہے
لپٹی ہوئی ہاتھ کی دھلی ساری میں

۲۰

گاتی ہوئی ہاتھوں میں یہ سنگر کی مشین / قطروں سے پسینے کے شرابور جبیں
مصروف کسی کام میں دیکھوں جو تجھے / تو اور بھی مجھ کو نظر آتی ہے حسین
آہٹ جو میرے قدموں کی جو سن پائی ہے / اک بجلی سی تن بدن میں لہرائی ہے
دوڑی ہے ہر اک سات کی سُدھ بسرا کے / روٹی جلتی توے پہ چھوڑ آئی ہے

۲۱

جانثار اختر کے گھر آنگن کا مرکزی کردار صفیہ اختر (جو مشہور ترقی پسند شاعر مجاز کی چھوٹی بہن اور خود بھی ادیب تھی)۔ جس نے جانثار اختر کی رفاقت میں نو سال کا عرصہ گزارا۔ ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو صفیہ کی جانثار سے شادی لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۵۳ء میں اِن کا انتقال ہو گیا۔ جانثار اختر کے ساتھ گزارے نو سالوں کی طویل داستان انھوں نے حرفِ آشنا اور 'زیرِ لب' کے خطوط میں رقم کر دی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو سر گزشت جانثار اختر نے شاعری میں بیان کی وہی داستانِ حیات صفیہ اختر نے اپنے محبوب شوہر کے نام لکھے۔ خطوط میں درج کر دی ہے۔ صفیہ کے خطوط ایک ہندوستانی عورت کے خطوط ہیں۔ اِن خطوط میں ایک ہندوستانی گھرانے کی تصویر ملتی ہے۔ یہاں بچوں کا ذکر بھی ہے، نوکروں، گاؤ تکیوں، فرش پر بچھی چاندنیوں، تخت پوشوں، سرخ بلاؤز اور ساڑھیوں، ایک شوہر پرست بیوی کے متلاطم جذبات، ہجر و فراق کے دُکھ، وصل کی تمنا محبوب شوہر کی یادیں، تنہائی میں گرتے آنسو اور کبھی نہ ختم ہونے والی تشنگی اور پیاس کا احساس بھی۔

> ''تم اگر کل صبح آ گئے تو میری عید ہوگی۔ ورنہ ایک پُر دبار، سنجیدہ مزاج عورت کی شان سے سب کچھ جھیل جاؤں گی اور ہر لمحہ آرزو کروں گی کہ تم مجھ سے دور بھی خوش ہی رہو۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہوگی۔'' (۴ر فروری ۱۹۴۴ء) ۲۲

> ''..........تمہارے کپڑے بھی سی کر استری کروا کر رکھے ہیں۔ اپنے کمرے کے لیے پردے خریدے ہیں خدا کرے تم پسند کرو۔ کب آؤ گے میری یہ حقیر سی پیشکش قبول کرنے جس کے ہر تار میں ایک دل دھڑکتا محسوس کرو گے۔'' (۴ر فروری ۱۹۴۴ء) ۲۳

> ''بعض حرکتیں تمہاری دل میں اُتر جاتی ہیں دوست۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے میں اور بچہ دونوں مسہری پر سو گئے تھے تم کالج سے واپس آئے۔ تم نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں جاگ گئی۔ اِس تنہائی اور بے کیفی میں یہ چھوٹی سی یاد میرا سرمایۂ حیات بنی ہوئی ہے دوست۔'' (۸ر مارچ ۱۹۴۷ء) ۲۴

۲۵ر دسمبر ۱۹۴۳ء میں صفیہ کی جانثار سے لکھنؤ میں شادی ہوئی۔ اِن دنوں صفیہ علی گڑھ کے ایک کالج میں لیکچرار تھیں اور جانثار گوالیار میں نوکری کر رہے تھے۔ شادی کے بعد دسمبر ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک ایک جگہ گھر بنانا نصیب نہیں ہوا۔ مل کر بچھڑنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء میں جانثار کو بھوپال میں ملازمت مل گئی۔ تو صفیہ نے بھی بھوپال کے کالج میں اپنا تبادلہ کرا لیا۔ دو سال بھوپال میں صفیہ اور اختر نے ایک ساتھ ایک گھر میں گزارے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی کے جرم میں

۱۹۴۹ء میں اختر کو استعفیٰ دینا پڑا اور وہ روزگار کی تلاش میں بمبئی چلے گئے۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک روز و شب کی داستان 'زیرِ لب' کے خطوط میں پوری جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔

بمبئی میں اختر نے بہت مشکل وقت دیکھا۔ جب وہ شکستہ دل ہو کر مایوسی کی باتیں کرتا تو ایسے میں صفیہ اس کی طاقت بن جاتی۔ ۳/اپریل ۱۹۵۱ء کے خط میں لکھتی ہیں:

> ''آج میں تمہارے دل میں ایسے خیالات کا آنا برداشت نہ کروں گی۔ تمہاری زندگی اور تمہاری تندرستی اور مسرتوں کی مجھے ضرورت ہے، میرے بچوں کو ضرورت ہے...... تم اِس طرح جینے کے مفہوم کو محدود نہ کر لیا کرو، خود کے لیے نہیں دوسروں کے لیے جیو پھر غم تمہارے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ آؤ مسکراؤ! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے آئے قاتل بننے والے میری امانت کے۔ تمہاری زندگی پر تمہارے علاوہ دوسروں کو اختیار حاصل ہے۔ اسے بھول مت جایا کرو۔'' ۲۵

> ''جسم کی دوری اذیت انگیز ضرور ہے مگر شکر ہے کہ ہمارے دماغوں کی رفاقت میں کوئی دوری پیدا نہیں کر سکتا۔'' (۲۷/اگست ۱۹۵۱ء) ۲۶

اِن خطوط کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ صفیہ، جاں نثار اختر کی صرف بیوی ہی نہیں بلکہ رفیق بھی ہے اور ساتھی بھی۔ وہ نئے زمانے کی ایسی پڑھی لکھی عورت ہے جو مرد کے بازوؤں کی زینت ہی نہیں بلکہ خود اس کا بازو بھی ہے۔ اِس کی قوت ہے اِس کی ناقد بھی ہے، دوست اور ناصح بھی۔ بقول فراق گورکھپوری:

> ''نرا عاشق، بڑا عاشق نہیں ہو سکتا۔ صفیہ اختر کے یہ خطوط اِس امر کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ نری بیوی بڑے معنوں میں جیون ساتھی نہیں بن سکتی۔ صفیہ اختر نری بیوی نہ تھی بلکہ بہت پڑھی لکھی، گونا گوں شخصیت رکھنے والی، علم و ادب و زندگی سے مہذب انہماک رکھنے والی، ایک سجل دل و دماغ و کردار رکھنے والی خاتون تھی اور جبھی وہ صحیح معنوں میں جاں نثار اختر کی جیون ساتھی بن سکی۔'' ۲۷

لیکن اِس مثالی جیون ساتھی کا احساس ہجر، اپنے محبوب سے دوری کا احساس اسے اندر ہی اندر کمزور کرتا چلا گیا۔ اِس کی بیماری نے طول پکڑا اور وہ اپنے محبوب شوہر کا دیدار کیے بغیر ۱۹۵۳ء میں لکھنؤ میں جان کی بازی ہار گئی۔ ڈاکٹروں نے صفیہ کی بیماری کی جو تشخیص کی اِس کی بڑی وجہ اعصابی کوفت کو قرار دیا اور اِس کا علاج اچھی غذا، سکون اور نارمل لائف تجویز کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کے خط میں وہ ملتمس۔ ہے:

> ''اختر میں نے اپنے پیار سے تمہیں جیتا ہے۔ تم بھی مجھے ایک بار زندہ کر دو۔ تم آجاؤ تو شاید میرا علاج کارگر ہو جائے۔'' (یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء) ۲۸

> ''آنے کے بارے میں تمہارے وعدے ایشیائی محبوبوں کے وعدوں سے کم نہیں۔''
> (۲/جون ۱۹۵۲ء) ۲۹

۲/نومبر ۱۹۵۲ء کے خط میں لکھتی ہیں:

> ''تم آسکو تو آجاؤ۔ میں چارپائی سے لگ گئی ہوں۔'' ۳۰

۲۹؍دسمبر ۱۹۵۲ء آخری خط، آخری التجاء۔

''عزیز اختر! میری جان

نظم ملی، تمہارا بہت پیارا تحفہ! سچ جانو میرے آنسو ہی تو چھلک پڑے۔ آج میں کتنی مغرور ہوں اور نازاں۔ مجھے تمہاری محبت، ملائمت، دوستی، شفقت خلوص اور اعتماد سب کچھ تو حاصل رہا ہے۔ آج مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ میں نے تمہاری شاعری کو بھی جیت لیا ہے۔ اب مجھے اور کیا چاہیے؟ اختر آؤ! تم مجھے مرنے نہ دو۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔'' ۳۱

لیکن جب اختر آیا تو اِس کی ملاقات صفیہ کی قبر کی گیلی مٹی سے ہوئی۔ جس سے لپٹ کر اس نے 'خاکِ دل' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی جو بے حد معروف ہوئی۔

لکھنو میرے وطن، میرے چمن زار وطن

تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جانِ بہار   اپنی دُنیائے حسین دفن کیے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی   آج وہ دل بھی یہیں دفن کیے جاتا ہوں

۳۲

بقول کرشن چندر:

''اُردو میں اِس نوع کی نظمیں بہت کم کہی گئی ہیں۔ یہ نہ تو نوحہ ہے نہ مرثیہ ہے، نہ مرنے والی کا قصیدہ ہے۔ اِس نظم پر تمہارے ذاتی غم کی چلمن تو پڑی ہوئی ہے لیکن اِس چلمن کے پیچھے پورا ہندوستانی گھر آباد ہے۔'' ۳۳

۱۹۵۳ء میں صفیہ کی وفات ہوئی اور ۱۹۵۶ء میں یہ ہندوستانی گھر پھر سے آباد ہوگیا۔ عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

''میں صفیہ سے کہا کرتی تھی تو مر جائے گی تو یہ مرد تیری قبر پر پلکوں سے جھاڑو دے گا۔ وہ نیک بخت بڑی خوش ہوتی تھی اور مرنے کی آرزو کرتی تھی۔ مجھے ایسے جذباتی انسانوں سے چڑ ہے۔ مگر اِن لوگوں سے جان چھڑانا بھی مشکل ہے۔ جان کو روگ بن کر لگ جاتے ہیں۔'' ۳۴

لیکن اختر نے صفیہ کا عکس خدیجہ میں پایا اور اسے اپنا لیا۔ 'فن و شخصیت' کے جانثار اختر نمبر کے لیے خدیجہ اختر نے ایک مضمون 'پرایا مگر اپنا' کے نام سے لکھا۔ اِس مضمون میں انھوں نے شادی سے پہلے لکھے گئے جانثار اختر کے خطوط سے اقتباس نقل کیے ہیں جس سے اِس بات کی تائید ہوتی ہے۔

''عورت کے بارے میں رسکن (Ruskin) نے لکھا تھا کہ: مرد کے سینے پر عورت کے نرم و نازک ہاتھ نیکی کا زیور سجاتے ہیں۔ آج کی عورت نے اِس خدمت کو پوری طرح اپنایا ہے۔ وہ اپنی نیکی سے مرد کو نیکی سکھاتی ہے۔ اپنے سماجی اخلاق سے مرد میں سماجی اخلاق پیدا کرتی ہے۔ خود زندگی کی جدوجہد میں حصہ لے کر مرد کو زندگی کی جدوجہد کا سبق دیتی ہے۔ ایسی عورت کی جھلک تم 'زیرِ لب' میں پڑھوگی۔ خود صفیہ کے کردار میں پاؤ گی۔ وہ اگر مجھ سے شدید محبت کرتی تھی تو اِس لیے کہ خود اسے

میری محبت حاصل تھی۔''۳۵

مذکورہ بالا دوسری ہستی صفیہ راشد، جدید اردو نظم کے معروف شاعر نذر محمد راشد (۱۹۱۰ء-۱۹۷۵ء) المعروف ن۔م۔راشد کی پہلی بیوی صفیہ سلطانہ (۱۹۱۵ء-۱۹۶۱ء) ہیں۔ جو ان کی ماموں زاد تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں دونوں کی شادی ہوئی۔ صفیہ اختر کی طرح صفیہ راشد کے خطوط تو شائع نہیں ہو سکے البتہ ن۔م۔راشد کے صفیہ راشد کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ ۲۰۱۰ء میں ان کی صاحبزادی نسرین راشد نے مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ خطوط ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء کے دوران ملتان اور دہلی سے ن۔م۔راشد اپنی اہلیہ کے نام لکھے ہیں۔ نسرین راشد نے ان خطوط کو جدید املا میں کمپوز کرانے کی بجائے مکاتیبِ راشد بخطِ راشد ہی مرتب کر کے شائع کر دیے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں ہی ڈاکٹر فخر الحق نوری نے ''میرے بھی ہیں کچھ خواب'' (بیاضِ راشد بخط راشد) بھی مرتب کی ہے لیکن اس کتاب میں ن۔م۔راشد کی نظموں کا مطبوعہ متن بھی شائع کیا گیا ہے۔ راشد کی وفات کے ۳۵ سال بعد ان کے قلم سے لکھے گئے ان کی پہلی بیوی صفیہ راشد کے نام ۵۳ خطوط (۴۰ خطوط ملتان سے اور ۱۳ خطوط دہلی سے) کے عکس کا شائع ہونا ن۔م۔راشد کی نجی زندگی کے بہت سے پوشیدہ اور متنازع سوالوں کے جواب فراہم کرتا ہے۔

نسرین راشد کی کتاب سے پہلے بھی صفیہ راشد کے نام ن۔م۔راشد کے کچھ خطوط 'کلاسیک' (کتابی سلسلہ) مرتبہ احمد داؤد، ظہیر الدین احمد، راولپنڈی، ۱۹۸۶ء اور ادبیات (اسلام آباد)، شمارہ ۲۷، ستمبر ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئے بعد ازاں نسیم عباس احمر نے ۲۰۰۸ء میں ن۔م۔راشد کے خطوط کو کتابی شکل میں یکجا کر دیا۔ اس کتاب میں مختلف رسائل (نیا دور، کلاسیک، ادبیات، افکار، شعر و حکمت) اور کتب (مکاتیب بنام غلام عباس، مقالاتِ ن۔م۔راشد، ن۔م۔راشد ایک مطالعہ) میں موجود ن۔م۔راشد کے خطوط کو زمانی ترتیب سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں صفیہ راشد کے نام ن۔م۔راشد کے ۹ خطوط بھی شامل ہیں جو انہوں نے ملتان میں ملازمت کے دوران اپنی بیگم کو لکھے۔ علامہ اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی[۳۶] کی طرح ن۔م۔راشد کی پہلی بیوی صفیہ سے ان کے تعلقات متضاد آراء کی بدولت موضوعِ بحث رہے ہیں جس زمانے (۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء) میں یہ خطوط لکھے گئے اس زمانے میں جیسے کہ ہم پہلے بھی تذکرہ کر آئے ہیں بہت سے شادی شدہ جوڑوں کے رومانوی خطوط بے حد مقبول ہو رہے تھے۔ شرعی محبت اور ازدواج کے مابین لکھے گئے خطوط ایک مقبول صنفِ ادب کے طور پر ادبی دنیا میں مقام بنا رہے تھے لہٰذا دہ شادی شدہ ادیب اور شاعر جو اپنی زندگی میں آسودہ نہیں تھے ان کا ناآسودہ تخیل فرضی محبت نامے تخلیق کر رہا تھا۔ ن۔م۔راشد کے لکھے ہوئے محبت ناموں کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ راشد کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے۔ راشد کے بیشتر نقادین کی تحقیق اس نتیجے پر منتج ہوتی ہے کہ راشد کی پہلی شادی ان کی مرضی کی شادی نہیں تھی۔۳۷

''وہ اپنی بیوی کی زندگی میں ہی بیوی سے ناآسودہ تھے یا ہو گئے تھے''۔۳۸

جب کہ ن۔م۔راشد کے بچے اس بات کی تردید کرتے ہیں ان کے بیٹے شہریار راشد کے بقول:

''میری والدہ ایک بہت سیدھی سادھی مذہبی قسم کی خاتون تھی۔ ویسے وہ اپنے خاندان میں پہلی عورت تھیں جس نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا...... میرا خیال ہے دونوں میں بچپن سے ایک لگاؤ چلا آ رہا تھا اسے آپ چاہیں تو انگھڑ قسم کی محبت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔''۳۹

نسرین راشد لکھتی ہیں:

"میرے والد کی شادی اپنی ماموں زاد صفیہ سے دسمبر ۱۹۳۵ء میں ۲۵ سال کی عمر میں ہوئی جبکہ والدہ کی عمر ۲۰ برس تھی...... والد اور والدہ شادی سے پہلے دونوں ایک دوسرے کو دل ہی دل میں چاہتے تھے مگر اس کا اظہار نہ کر پاتے کچھ شرم و حیا کی وجہ سے اور کچھ بڑوں کے سامنے بولنے کی جرأت نہ ہونے کی وجہ سے...... میرے والد کی لکھی ہوئی بعض نظمیں میری والدہ سے منسوب ہیں جن میں اداسی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً (میں اسے واقفِ الفت نہ کروں)" ۴۰

راشد کے صفیہ کے نام لکھے گئے کئی خطوط بھی نسرین راشد کی اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کے خط کا آغاز ایک چینی شاعر کی نظم سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

شانگ یا! میں تم سے محبت کرنا چاہتا ہوں
ایسی محبت جو ہمیشہ ہمیشہ رہے
کبھی فنا نہ ہو
یہاں تک کہ تمام پہاڑیاں میدان بن جائیں
دریا سوکھ جائیں
موسم سرما میں کوندی ہوئی بجلی کی مہیب گرج سنائی دینے لگے
موسمِ گرما میں برف پڑنے لگے
مینہ برسنے لگے اور آسمان و زمین آپس میں مل جائیں
لیکن میں کسی بھی حالت میں تم سے جدا نہ ہوں

صفیہ یہ ایک چینی شاعر کی نظم ہے جو حضرتِ مسیح کی پیدائش سے بھی ایک سو سال پہلے لکھی گئی تھی اس شاعر نے میرے خیالات کی کیسی دلکش ترجمانی کی ہے۔ شانگ یا شاعر کی محبوبہ ہے اور تم میری محبوبہ ہو میں بعینہٖ یہی الفاظ تمہیں مخاطب کر کے کہہ رہا ہوں۔" ۴۱

جہاں ایک طرف ن۔م۔راشد اپنی ماموں زاد صفیہ سلطانہ کی محبت میں گرفتار ہیں وہاں صفیہ سلطانہ کے لیے بھی راشد کے بغیر جینے کا تصور بھی محال ہے:

"میری والدہ ہمیں بتاتی تھیں کہ انہیں اپنے پھوپھی زاد راشد سے بے پناہ محبت تھی اور سوچا کرتیں کہ اگر تمہارے والد نہ ملتے تو میں خودکشی کر لیتی" ۴۲

صفیہ کی والہانہ محبت میں پرستش کا رنگ جھلکتا ہے جس نے راشد کو بے خود کر دیا ہے:

"تم نے اپنی پرستارانہ محبت سے مجھے بے خود و سرشار کر دیا ہے۔ تم نے مجھے اپنے آپ سے چھین لیا ہے۔" (۲۳/ ستمبر ۱۹۳ء) ۴۳

وہ راشد جو مزاجاً روکھے پھیکے اور سخت مزاج مشہور تھے صفیہ کی محبت نے انھیں یکسر بدل دیا تھا:

"تم حیران ہو گی کہ میں بعض دوستوں کا تمسخر اڑایا کرتا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتے ہیں اور یہ تو قطعی

طور پر کہا کرتا تھا کہ بیوی سے کس کم بخت کو محبت ہوسکتی ہے۔ جو عورت تمہاری ملکیت میں ہے اس سے جذباتی محبت کیسی۔ بس زندگی مل کر گزارنا ہے گزارتے چلے جاؤ لیکن اب جانا ہے کہ بیوی سے بھی کس قدر محبت ہوسکتی ہے اور یہ جانا ہے کہ ایک اچھی بیوی سے ایک چاہنے والی بیوی سے جس کمبخت کو محبت نہیں وہ دنیا میں تیرہ نصیب ہے۔" (۲رمارچ ۱۹۳۶ء)۴۴

راشد نے ۱۹۳۲ء میں ایم اے معاشیات کا امتحان پاس کیا۔ ساڑھے تین سال کا عرصہ بے کاری میں گزرا۔ ستمبر ۱۹۳۵ء میں کمشنر آفس ملتان میں ۴۲ روپے ماہوار پر ریکارڈ کیپر کی ملازمت ملی جسے انہوں نے زائدالعمر (overage) ہونے کے خوف سے قبول کرلیا۔ ستمبر سے نومبر ۱۹۳۵ء یعنی دو ماہ تک اس عہدے پر کام کیا۔ ۲۵ رنومبر ۱۹۳۵ء کو راشد سینئر کلرک بنادیئے گئے۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو اسسٹنٹ بن گئے اس حیثیت سے انہوں نے ۳۰ راپریل ۱۹۳۹ء تک کام کیا۔ مجموعی طور پر راشد نے کمشنر آفس ملتان میں تقریباً ساڑھے تین سال کا عرصہ گزارا۔۴۵

راشد کے برسرِ روزگار ہوتے ہی ۳۰ ردسمبر ۱۹۳۵ء کو ان کی شادی ماموں زاد صفیہ سلطانہ سے ہوگئی۔ نئی نویلی دلہن کو سسرال (سرگودھا۔لدھیانہ) میں چھوڑ کر راشد ملازمت کے لیے ملتان آگئے۔

"اپنا تھکا ہوا جسم اور اداس روح لے کر میں پھر یہاں پہنچ گیا ہوں۔ کتنی بے بسی ہے کہ پھر میں اور تم چند لمحوں سے زیادہ ایک دوسرے کے پاس نہیں رہ سکے۔" (۳۰ رجنوری ۱۹۳۶ء)۴۶

نئی نئی شادی، روزگار کے مسائل، پہلی پہلی محبت کا نشہ، ہجر و فراق کے کٹھن لمحات اور اس کے ساتھ ساتھ خاندان کے رسوم و رواج، مذہبی جکڑ بندیاں اور والدین کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیاں، گھر اور بیوی سے دوری کا شدید احساس۔ ۲۶ رفروری ۱۹۳۶ء کے خط میں راشد لکھتے ہیں:

"صفیہ میں نے اباجی کو تمہیں یہاں ساتھ لانے کے متعلق لکھا تھا نا۔ انہوں نے بڑے مزے کا جواب دیا ہے۔ لکھتے ہیں "گرم گرم دودھ گھونٹ لے لے کر پینا چاہیے جو لوگ شتاب کاری کرتے ہیں بالآخر جلد متنفر ہوجاتے ہیں۔" لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس دودھ کو اگر نئے سرے سے آگ پر نہ رکھ دیا جاتا تو یہ ٹھنڈا یخ ہوجانے کو تھا۔ صفیہ ان بڑے لوگوں کے لیے شادی صرف شادی ہے انہیں کیا معلوم کہ ہمارے لیے یہ دلوں کا آہنگ ہے۔"۴۷

۲رمارچ ۱۹۳۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے سب سے زیادہ اباجان کی طرف سے تمہیں اپنے ساتھ لانے کے لیے اجازت نامہ کا انتظار ہے میں نے اس بارے میں انہیں دوبارہ سہ بارہ لکھا ہے۔ اگر اب بھی انہوں نے اجازت نہ دی تو مجھے سخت صدمہ ہوگا۔"۴۸

اس قدامت پرستی، خاندانی جبر، مذہبی اور شرعی احکامات کی پابندی، کلرکی کی اذیت اور اپنی محبوب بیوی سے دوری کے زمانے میں صرف یہ خطوط ہی تھے جو راشد کے لیے سہارا بنے ہوئے تھے، لہٰذا وہ بار بار ان خطوط میں صفیہ کو خط کا جواب جلد لکھنے کی تاکید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

"میری صفیہ، مجھے خط لکھنے میں کوتاہی نہ کیا کرو، تمہارے خط میری روح کی غذا ہیں۔ غذا کے بغیر انسان کتنے دن زندگی بسر کرسکتا ہے۔" (یکم؍اکتوبر۱۹۳۶ء) ۴۹

پیار محبت کے والہانہ اظہار کے ساتھ ساتھ ان خطوط میں شکوے، شکایت، طنز، طعنے، کوسنے، بدگمانیاں، وسوسے، شکوک، شبہات، ڈر خوف سبھی کچھ ملتا ہے۔ راشد کے مزاج میں غصے اور جلال کا عنصر نسبتاً زیادہ پایا جاتا تھا انہیں غصہ جلد آتا تھا اور غصے میں وہ تیز و تند ہو جاتے تھے۔ اس کی تائید انہوں نے ایک خط میں بھی کی:

"میں حساس ضرور ہوں اور بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ آجاتا ہے...... بہرحال میں ظالم نہیں ہوں غیور ہوں اور اسے مرد کی سب سے بڑی خوبی سمجھتا ہوں۔" (۲۸؍فروری۱۹۳۶ء) ۵۰

"مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ شادی سے پیشتر میں تمہاری نظر میں ایک قاہر و جابر انسان تھا۔" ۵۱

گزرتے وقت، خاندانی روایات اور روزگار کے مسائل نے ازدواج کے درمیان موجود والہانہ محبت کو بہت جلد بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں بدل دیا۔ راشد کے صفیہ کے نام بیشتر خطوط ایسے ہیں جن میں راشد اپنی محبوب بیوی کو اپنی محبت اور وفاداری کا یقین دلانے کی کوشش میں مصروف دکھائی دیتے ہیں:

"جب تم میری محبت سے بے بنیاد طور پر مایوسی کا اظہار کرتی ہو تو میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ بے بسی سی محسوس ہوتی ہے کہ آخر میرے پاس اور کونسا ذریعہ ہو کہ تمہیں محبت کا یقین دلاسکوں۔" (۱۵؍فروری۱۹۳۶ء) ۵۲

بدگمانیاں کی حتی الامکان تلافی کا انداز ملاحظہ کریں:

"جب میں تمہیں ملنے گوجرانوالہ گیا تو میری اس آمد کو بھی تم نے کپڑے سلوانے بلکہ استری کروانے، کی ضرورت پر محمول کیا۔ ہے نا؟ اب یا تو یہ محض شرارت ہے یا پھر واقعی تم کسی کے جذبات کی قدر کرنا نہیں جانتیں۔ اگر مؤخر الذکر بات ہے تو لیجئے صاحب؟ کبھی گوجرانوالے کی طرف رخ ہی نہیں کریں گے۔" (۱۵؍جنوری۱۹۳۸ء) ۵۳

بیشتر خطوط میں راشد کے لہجے کی جھنجھلاہٹ جلالی کیفیات میں ڈھلتی دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی زوجہ محترمہ کی توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی اور کم فہمی سے راشد نہ صرف نالاں دکھائی دیتے ہیں بلکہ شکوہ کناں بھی ہیں:

"اگر میں نے یہ فقرہ کہہ دیا ہے کہ میں تمہیں لاکر پچھتا رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں خدانخواستہ "طلاق" دینا چاہتا ہوں یا گھر سے ناراض ہو کر نکل جانا چاہتا ہوں یہ کہا ہے تو صرف اس لیے کہا ہے کہ تم میرے ساتھ اپنا سلوک اور بہتر کر کے دکھاؤ لیکن خدا ان تعبیر نامے بنانے والوں کی نسل تباہ کرے۔ تمہیں ان جھوٹی باتوں پر اتنا یقین ہے کہ جانے بوجھے تم نے میری محبت کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے۔" (۲۳؍فروری۱۹۳۸ء) ۵۴

بدگمانیاں، شکوک و شبہات، وسوسے بڑھ کر غلط فہمیوں کا روپ جلد اختیار کر گئے اور بات طلاق سے ہوتی ہوئی خودکشی پر جا پہنچی۔

"تمہیں دوبارہ ملنے کی آروز کی بے تابی کے باوجود وہ ہیبت ناک تصورات جو تمہاری خودکشی کی کوششوں کے ساتھ وابستہ ہیں میرے دل میں پیدا ہوکر میرا قلم روک لیتے ہیں۔" (۲۶؍نومبر ۱۹۳۸ء) ۵۵

ملتان میں کلرکی کا زمانہ راشد کے لیے تکالیف ومصائب سے بھرپور تھا، ملتان میں ایک تو انہیں ادبی ذوق کے مطابق مجالس اور احباب میسر نہیں آئے دوسرے معاشی اعتبار سے بھی یہ دور راشد کے کے لیے بہت سخت ثابت ہوا۔ راشد کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ ملتان اور کلرکی ان کی منزل نہیں ہے انہیں آگے جانا ہے اس دلدل سے نکلنا ہے:

"میرے نزدیک کھانا پینا، سونا اور کلرکی کر کے ختم ہو جانا زندگی کا منشا ہرگز نہیں ہے۔" (۲۳؍فروری ۱۹۳۸ء) ۵۶

انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ صفیہ کی ہمت بندھانے کی کوشش بھی کرتے رہے۔

"میں دنیا میں بہت بڑا شاعر اور بہت بڑا ادیب بننا چاہتا ہوں خدا نے توفیق دی تو تمہاری محبت ان مقاصد کے حصول میں میری حامی و مددگار ہوگی۔ تم جیسی محبت کرنے والی بیوی ایک نعمت ہے۔" (۱۲؍اپریل ۱۹۳۶ء) ۵۷

ملتان سے نکلنے کے لیے انہوں نے ہاتھ پاؤں مارے بالآخر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی کے دفتر میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا۔ ۲۸؍فروری ۱۹۳۹ء میں آغا عبدالحمید کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے ۱۰؍مارچ کو دہلی پہنچنا ہے۔ ریڈیو والوں نے ملاقات کے لیے یاد فرمایا ہے۔ کیا تم میرے لیے بخاری کو کچھ لکھ سکو گے؟ .... جہاں مجھ جیسے بے شمار اور بے حد برے آدمی ریڈیو کے محکمے میں کھپ سکتے ہیں اور محض سفارش کے زور پر، تو میرے لیے بھی کوئی گوشہ کہیں ضرور ہوگا۔ اگر یہی چیز اس دفتر کے کیچڑ سے نکلنے میں مددگار ثابت ہو جائے تو غنیمت ہے۔" ۵۸

دہلی سے جو خطوط راشد نے صفیہ کے نام لکھے ان میں پیار، محبت، شکوے شکایات کے ساتھ ساتھ جو رنگ سب سے نمایاں ہے وہ ہے بچوں کے ساتھ راشد کی جذباتی وابستگی۔ بچوں کی صحت وتندرستی کی فکر، کبھی ان کے لیے پیسے بھجوا رہے ہیں کہ بچوں کے گرم کپڑے لیے جائیں، اگر بچوں کی طبیعت خراب ہے تو کبھی کسی حکیم سے اور کبھی ڈاکٹر سے دوائیں لے کر بھجوا رہے ہیں۔ باپ بننے کے بعد راشد کی شخصیت میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں اور کس طرح بچوں کی چھوٹی چھوٹی بات کا خیال رکھتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

"نسرین کے لیے نظامی صاحب کی بنائی ہوئی دوائی بھیج رہا ہوں۔ ایک ٹکیہ ایک شیشی میں سے صبح اور ایک ٹکیہ دوسری شیشی میں سے شام کو اسے کھلاتی رہو۔ ثقیل چیزیں نہ کھانے دو اور اگر ہو سکے تو کسٹرائل کا ہلکا سا جلاب دے دو، انشاء اللہ آرام ہو جائے گا۔" (۲۳؍اکتوبر ۱۹۴۱ء) ۵۹

"میں اس لیے چاہتا تھا کہ نسرین دہلی آجائے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ سانگلے کی آب وہوا اسے راس نہیں آئی۔ بچوں کو مکھن وغیرہ زیادہ نہیں کھلانا چاہیے۔ گلوکوز کا استعمال اس کے لیے ضروری ہے۔ اگر وہاں سے دستیاب نہ ہو سکے تو میں یہاں سے ایک دو ڈبے بھیج دوں گا۔" (۴؍نومبر ۱۹۴۱ء) ۶۰

ملتان سے آل انڈیا ریڈیو، دہلی، لاہور، پشاور، کراچی، یونائیٹڈ نیشنز ہیڈ کوارٹرز، نیویارک، انڈونیشیا، ایران آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں یو۔این انفارمیشن سنٹر تہران کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ یعنی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۳۹ء میں ملتان سے نکلنے کے بعد بھی وہ مسلسل ملازمت کے سلسلے میں اپنے شہر، بعد ازاں اپنے ملک سے باہر رہے لیکن دسمبر ۱۹۴۱ء کے بعد صفیہ راشد کے نام ان کا کوئی خط دستیاب نہیں ہے۔ گزرتے وقت نے جہاں ان کے درمیان فاصلوں کو بڑھایا وہاں ۵ بیٹیوں اور ایک بیٹے کا والد بھی بنا ڈالا لیکن جذبات و احساسات میں وہ شدت اور خلوص رفتہ رفتہ ختم ہوتا چلا گیا جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء کے دوران لکھے گئے خطوط میں شدت سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ بقول ساقی فاروقی:

''پہلی بیوی کی منفعلانہ شخصیت تھی جوان کی بے قدری کا شکار ہوئی۔'' ۶۱

یو۔این۔او ملازمت کے دوران ن۔م۔راشد اپنے بیٹے شہریار کو اپنے ساتھ نیویارک لے گئے لیکن صفیہ چھوٹے بچوں کے ساتھ پاکستان میں ہی رہیں۔

''اقوامِ متحدہ کی ملازمت ہی کے سلسلے میں وہ بعد میں انڈونیشیا چلے گئے وہاں انہوں نے یو۔این۔انفارمیشن سنٹر کے ڈائریکٹر کے طور پر کام کیا۔ اس دوران والدہ بال بچوں کے ساتھ پاکستان ہی میں رہیں۔'' ۶۲

۱۹۶۱ء میں صفیہ راشد کا انتقال ہوگیا۔ نسرین راشد لکھتی ہیں:

''میرے والد اپنی زندگی میں کہتے رہتے کہ وہ بھی کوئی مرد ہے جو آنسو بہائے مگر میری والدہ کی وفات پر ساری رات (sarong) انڈونیشین دھوتی پہن کر والدہ کے پلنگ کے سرہانے روتے رہے اور کہتے رہے، صفیہ میرے بچے کہاں جائیں گے۔'' ۶۳

صفیہ راشد کو پاکستان میں سپردِ خاک کر کے راشد اپنے بچوں کو لیکر نیویارک آگئے۔ شہریار راشد نے اپنے والد کی وفات پر ایک مضمون لکھا جو ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتبہ کتاب ''ن۔م۔راشد ایک مطالعہ'' میں شامل ہے۔ مضمون انگریزی زبان میں ہے جس کا ترجمہ انتظار حسین نے کیا ہے اس میں شہریار راشد نے ن۔م۔راشد اور صفیہ کے درمیان ذہنی بُعد کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگرچہ میری والدہ کو گنٹھیا نے مار رکھا تھا اور یوں بھی والد صاحب اور ان کے درمیان ذہنی سطح کا بہت فرق تھا............۱۹۶۱ء میں میری والدہ نے گنٹھیا کے علاج کے چکر میں انٹرمسکولر انجکشن لگوایا۔ بدقسمتی سے انجکشن غلط لگا اور وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں ایک طرح سے دیکھئے تو یہ قبل از وقت موت دونوں ہی کے حق میں نیک ثابت ہوئی۔ والدہ کو اذیت سے نجات مل گئی اور والد کے لیے ایک نئی ذہنی زندگی کا آغاز کرنے کی گنجائش پیدا ہوگئی۔'' ۶۴

اس گنجائش کے پیشِ نظر ستمبر ۱۹۶۳ء میں ن۔م۔راشد نے شیلا انجلینی سے جو کہ یو۔این۔او کے سکول میں ٹیچر تھیں اور راشد کی سب سے چھوٹی بیٹی تمزین کی استاد بھی تھی، ایک مختصر عشق اور کورٹ شپ کے بعد شادی کر لی۔ ان دنوں وہ کس قدر پرجوش تھے۔ شیلا کے ساتھ عشق اور پھر شادی ان کے لیے ایک معرکہ سر کرنے کے متبادل بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد ''راشد یادوں کے آئینے

میں'' لکھتے ہیں:

''راشد صاحب کو طرح طرح کے توہمات نے گھیر رکھا تھا..........کبھی ان کو رنگ و نسل کا فرق پریشان کرتا تھا اور کبھی عمروں کا تفاوت اور سب سے زیادہ رقیب کا سایہ کہ جو شیلا کے ماضی میں لرز رہا تھا اور راشد کو اس اندیشے نے مار رکھا تھا کہ شیلا کے یورپ جانے پر وہ کہیں نمودار نہ ہو جائے اور بنی بنائی بات بگاڑ دے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں راشد کے اندر ''شوق کی وارفتگی'' اور خریدار کی طلب نے ایک حشر بپا کر رکھا تھا.......... وہ عشق نہیں کر رہے تھے ایک مہم پر رواں تھے جس میں انہوں نے ''متاعِ عقل و دل و جاں'' کی بازی لگا رکھی تھی اور جس میں انہیں بہر حال کامیاب ہونا تھا..........وہ اپنے آپ کو قدیم اردو شاعروں کا ناکام و نامراد اور غمزدہ عاشق زار دیکھنے پر ہرگز تیار نہیں تھے وہ تو ہمیشہ ان کی طنز کا ہدف بنا رہا تھا۔''۶۵

راشد کی دوسری شادی کی ان کے رشتہ داروں نے پرزور مخالفت کی ان کے بچے بھی اس شادی سے خوش نہیں تھے بلکہ انہوں نے باپ کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا لیا تھا جس نے تاعمر راشد کو مضطرب رکھا:

''نسرین نے ازل سے ایک بے قرار روح پائی ہے بڑی حد تک اپنی موجودہ مصروفیت سے مطمئن نظر آتی ہے۔ لیکن مجھ سے عجیب و غریب تقاضے کرتی ہے اور توہین آمیز باتیں کرتی رہتی ہے اگرچہ پہلے سے بہت کم۔ خدا اس کو تسکین قلب دے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس کی شادی نہیں ہوئی۔ ورنہ بچوں کی ماں بن کر اگر اسے طلاق مل جاتی جبکہ اسے کوئی ہنر تک نہیں آتا تو ایک مصیبت برپا ہو جاتی۔ اس کے لئے بھی اور مجھ ناچیز کے لیے بھی۔'' (۲۲/اپریل ۱۹۷۳ء)۶۶

ان کے بڑے صاحبزادے شہریار نے انہیں بتائے بغیر شادی کر لی۔ شادی میں شرکت کی دعوت بھی نہ دی۔ امین حزین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''شہری آج کل پیرس میں ہے پاکستان کے سفارت خانے میں تھرڈ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کر رہا ہے..........اس کی بیوی ابھی تک کراچی میں ہے..........وہ اپنے رشتے سے خوش معلوم ہوتا ہے اور میں نے بھی اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی کہ کیوں مجھے شادی میں شریک نہ کیا گیا یا اجازت نہ لی گئی یا اطلاع نہ دی گئی۔'' (۱۰/مارچ ۱۹۷۳ء)۶۷

لیکن اس کے باوجود راشد کو اپنے بچوں سے شدید محبت تھی اور ان کے روشن مستقبل کے لیے ہمہ وقت کوشاں بھی رہے۔

''راشد اپنے بچوں کا ذکر نہایت شفقت اور محبت سے کرتے، خطوں میں تاخیر ہوتی تو رنجیدہ رہتے، ہمہ وقت ان کی خیریت کی فکر لگی رہتی۔ کسی کا خط ملتا تو چہرے پر دھوپ نکل آتی۔ مگر اپنی ایک بیٹی کے مستقبل کی فکر سے اکثر مضمحل رہتے۔ کہتے کہ اس لڑکی کو شاید کبھی معلوم نہ ہوگا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں وہ مجھ سے خفا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ صاحبزادی ان سے خفا کم اور روٹھی ہوئی زیادہ تھیں۔''۶۸

اور کچھ اسی طرح کا رویہ شہریار راشد کا بھی رہا:

''میں نے اپنے باپ سے بہت کچھ حاصل کیا اور بھی بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا لیکن میں تو جب تک وہ جیتے رہے بغاوت پر تلا رہا۔''۶۹

ایسی بغاوت جانثار اختر کے بیٹے جاوید اختر میں بھی دکھائی دیتی ہے:

''اس کی ضروری غیر ضروری فقرہ بازی سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ ''مجھے اپنے باپ سے محبت ہے نہ نفرت۔ میں گھر میں نہیں رہتا بلکہ یہاں اسٹوڈیو کے کسی بینچ پر سو جاتا ہوں۔ ہر کسی کا مذاق اڑانے والا لطیفہ گو جاوید! اندھیری والی انٹی کے اڈے میں کچی شراب کے دو پیگ پینے کے بعد ہمیشہ کہا کرتا تھا 'میں اپنے باپ سے بڑا رائٹر بن کر دکھاؤں گا۔''۷۰

بحیثیت باپ راشد کو بھی اپنے بچوں سے یہ شکایت رہی کہ وہ اپنے باپ سے ہمیشہ بدگمان رہے۔

''آج کل اولاد کا پیدا کرنا اور انہیں پال پوس کر بڑا کرنا بہت بڑا سانحہ ہے۔ تمہارے بھی چھ بچے ہیں اور میرے بھی۔ ساری زندگی ان کی خاطر چکی پیستے گذر گئی ہے لیکن ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا نیک بخت ہو جسے اس بات کا احساس ہو۔'' (۲۲/مارچ ۱۹۷۳ء)۷۱

اور یہ بھی ایک المیہ ہے کہ راشد نے جن ذہنی اور جذباتی تشنگیوں کی سیرابی کے لیے دوسری شادی کی وہ رفاقت انہیں شیلا سے بھی نہ مل پائی اور وہ ایک دوسرے کے ذہنی رفیق اور جیون ساتھی بننے کی بجائے محض ایک دوسرے کی مجلسی ضرورت بن کر رہ گئے [۷۲] اور راشد جو کہا کرتے تھے کہ:

''جو عورت مرد کو اپنے افسوں میں عمر بھر گرفتار نہیں رکھ سکتی اس عورت کو خود اپنے آپ پر لعنت بھیجنا چاہیے۔ اس میں مرد کا ایسا کیا قصور ہے۔'' (۲۸/فروری ۱۹۳۶ء)۷۳

وہی راشد شیلا کی بے تعلقی اور کٹھ حجتی دیکھ کر بار بار فیض کی بیوی اور غلام عباس کی بیوی کی مثالیں دیا کرتے تھے۔۷۴ امین حزیں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بیوی (شیلا) خدا کے فضل سے نہایت نیک خصلت اور اوصاف حمیدہ کی مالک ہے اگرچہ بعض دفعہ غالب کا یہ مصرع زبان زد ہو جاتا ہے۔ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں!'' (۱۰/مارچ ۱۹۷۳ء)۷۵

اسی طرح جانثار اختر بھی اپنی دوسری بیگم خدیجہ اختر سے یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

''میں تم سے اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے صفیہ کا تذکرہ نکال لیتا ہوں، بہرکیف اس کے لیے تم سے معذرت نہیں کروں گا۔ یہ تو میری زندگی کا راز ہے شاید تمہیں جاننے کا راز بھی یہی ہو کہ تمہاری بعض باتیں مجھے صفیہ کی یاد دلاتی ہیں۔''۷۶

رومان، عشق، والہانہ محبت، مثالی جوڑے، مثالی رشتے، مثالی مرد اور آئیڈیل عورت یہ چند مبہم الفاظ اپنے اندر معانی و مطالب کی ایک وسیع کائنات چھپائے ہوئے ہیں۔ تصویر کا ایک رخ جو کہانی سناتا ہے تصویر کا دوسرا رخ نہ صرف پہلے پہلو کی تردید کرتا ہے بلکہ کہانی سننے والے کو کہانی کی ایسی نئی سرزمینوں کی طرف لے جاتا ہے کہ وہ کہانی کی مختلف اور متنوع جہات کی

دریافت میں ایسی بھول بھلیوں میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے کہ جن سے رہائی بے حد مشکل ہو جاتی ہے بالکل یہی کیفیت مشاہیر ادب کے خطوط کے مطالعے سے بھی ہوتی ہے۔

اقبال ہوں یا شبلی، فیض ہوں یا سجاد ظہیر، جاں نثار اختر ہوں یا ن۔م۔راشد ہر بڑے جینئس کی زندگی کی مختلف جہتیں ہیں۔ متنوع رنگ ہیں، متضاد نقش ہیں۔ اسی تضاد سے ان کی شخصیات بنتی ہیں، نکھرتی ہیں۔ سنورتی ہیں، اور اپنی تخلیقات کے ساتھ ساتھ اپنے مکاتیب میں بھی اظہار پاتی ہے۔ پورے سچ تک رسائی تو بے حد مشکل ہیں البتہ حقائق کی تلاش کا سفر ازل سے جاری ہے اور رہے گا۔ لیکن اس مضمون کو لکھتے ہوئے ایک خیال مجھے بار بار پریشان کرتا رہا کہ آج کا محقق ایک صدی یا کئی صدیاں پیشتر کے لکھے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے خطوط کے ذریعے ان کی شخصیت کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن آنے والے کل کا محقق جو کہ موبائل ایس ایم ایس اور انٹرنیٹ ای میل کے دور میں زندہ ہے جہاں خط کا جواب بھی دوست احباب فون، ایس ایم ایس اور ای میل کے ذریعے دیتے ہیں تو ایسے میں وہ اپنے عہد کے مشاہیر کی شخصیات کو سمجھنے کے لیے کونسا ذریعہ اپنائے گا۔

حواشی:

1. مالک رام، اُردو کے منفرد مکتوب نگار، مطبوعہ: نقوش لاہور، مکاتیب نمبر (جلد اوّل)، نومبر ۱۹۵۷ء، شمارہ ۵۵، ۶۶ ص ۳۹
2. ڈاکٹر سید عبداللہ، اُردو خط نگاری، مطبوعہ: نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر (جلد اول)، ص ۲۲
3. معین الدین احمد انصاری مکاتیب شبلی کی روشنی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ص ۵۰
4. رضیہ سجاد ظہیر، ۱۹۱۸ء میں اجمیر میں پیدا ہوئیں۔ اِن کے والد کا نام سید رضا حسن تھا۔ جن کا حکومت وقت نے 'خان بہادر' کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ اِن کی تمام تعلیم گھر پر والد کی نگرانی میں ہوئی۔ بی اے بھی پرائیویٹ ہی کیا۔ شادی سے پہلے رضیہ دلشاد کے نام سے کہانیاں لکھتی رہیں۔ بعد میں رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے معروف ہوئیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ناول بھی اور مختلف غیر ملکی زبانوں کے ادب کے تراجم بھی کیے۔
5. رضیہ سجاد ظہیر، ''انتظار ختم ہوا، انتظار باقی ہے''، مشمولہ۔ سجاد ظہیر۔ شخصیت و فکر، (مرتبہ) ڈاکٹر سیّد جعفر احمد، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۰
6. سجاد ظہیر، نقوشِ زنداں (مرتبہ) رضیہ سجاد، مکتبہ شاہراہ دہلی، ۱۹۵۱ء، ص ۱۷۶-۱۷۵
7. ایضاً ص ۱۷۷
8. ایضاً ص ۱۷۴
9. ایضاً ص ۱۲۹
10. عبدالرؤف ملک (مرتبہ) سیّد سجاد ظہیر، مارکسی دانشور اور کمیونسٹ راہنما (مرتبہ) پیپلز پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۹
11. سجاد ظہیر، نقوشِ زنداں، ص ۷-۸
12. نور سجاد ظہیر، میرے حصے کی روشنائی، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۸۱
13. فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، فرید بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۷۳

۱۴۔ ایلس کیتھرین جارج کا تعلق لندن سے تھا انگریزی کے ساتھ فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں پر بھی عبور تھا فنِ مصوری اور موسیقی سے بھی خاص لگاؤ رکھتی تھیں۔ ایم ڈی تاثیر کی اہلیہ کرسٹابیل (کرس) کی چھوٹی بہن تھیں بائیں بازو کی سرگرم رُکن تھیں ۱۹۴۱ء میں فیض اور ایلس کی شادی ہوئی۔

۱۵۔ فیض احمد فیض، صلیبیں میرے دریچے میں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۷۲ء، ص ۴۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۰۱-۱۰۲

۲۰۔ جاں نثار اختر، کلیاتِ جاں نثار اختر، المسلم پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۴۰۳

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۹۷

۲۲، ۲۳۔ صفیہ اختر، حرف آشنا، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۳۴-۳۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۷۷-۷۸

۲۵۔ صفیہ اختر، زیرِ لب، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۸۷-۱۸۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۹۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۳۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۸۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۰۳

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۰۶

۳۲۔ جاں نثار اختر، کلیاتِ جاں نثار اختر، ص ۵۹۰

۳۳۔ جاں نثار اختر کے نام کرشن چندر کا ایک خط، مشمولہ: زیرِ لب، ص ۱۸

۳۴۔ عصمت چغتائی، کانٹوں بھری وادیاں، مطبوعہ: فن اور شخصیت، جاں نثار اختر نمبر، شمارہ ۲، ۳، مارچ ۱۹۷۶ء، ص ۴۱۵

۳۵۔ خدیجہ اختر، پرایا مگر اپنا، مشمولہ: فن اور شخصت، جاں نثار اختر نمبر، ص ۴۹۶

۳۶۔ علامہ اقبال کی پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی صاحبزادی کریم بی بی سے ہوئی، شادی کے وقت اقبال کی عمر ۱۶ برس اور کریم بی بی کی عمر ۱۹ سال تھی۔ کریم بی بی سے اقبال کے دو بچے بھی ہوئے ایک بیٹی معراج بیگم اور ایک بیٹا آفتاب اقبال۔

۳۷۔ ڈاکٹر ضیاء الحسن، ن م راشد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶

۳۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ن م راشد - ایک مطالعہ، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۸

۳۹۔ شہریار راشد، میرے والد، مشمولہ: ن م راشد۔شاعر اور شخص، مرتبہ: ڈاکٹر آفتاب احمد، دانیال، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۵

۴۰۔ نسرین راشد، مرتبہ: ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام، اے آر پرنٹرز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۴۲۔ ایضاً ص ۱۲

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۴۴۔ ایضا، ص ۵۶

۴۵۔ ڈاکٹر فخر الحق نوری، مطالعہ راشد (چند نئے زاویے) مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۴۲

۴۶۔ نسرین راشد، ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام، ص ۴

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۸

۴۸۔ ایضاً، ص ۵۳

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۵۰،۵۱۔ ایضاً، ص ۴۹

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۸

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۵۳-۱۵۴

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۵۷۔ ایضاً، ص ۹۶

۵۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ن م راشد۔ایک مطالعہ، ص ۲۳۵

۵۹۔ نسرین راشد، ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام، ص ۱۸۱

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۸۶

۶۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ن م راشد۔ایک مطالعہ، ص ۲۸

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۶

۶۳۔ نسرین راشد، ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام، ص ۱۳

۶۴۔ ڈاکٹر آفتاب احمد، ن م راشد۔شاعر اور شخص، ص ۱۵

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۶۶۔ نسیم عباس احمر، ن م راشد کے خطوط، مرتبہ: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۶

۶۷۔ ایضاً، ص۱۷۵
۶۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ن م راشد۔ایک مطالعہ، ص۳۱
۶۹۔ ڈاکٹر آفتاب احمد، ن م راشد۔شاعر اور شخص، ص۲۲
۷۰۔ پریم وار برٹنی، دوٹکڑوں میں بٹا ہوا آدمی، مطبوعہ: فن اور شخصیت، جانثار اختر نمبر، ص۴۲۷
۷۱۔ نسیم عباس احمر، ن م راشد کے خطوط، ص۱۷۵
۷۲۔ ساقی فاروقی نے اپنی خود نوشت سوانح آپ بیتی/ پاپ بیتی میں شیلا اور ن۔م۔راشد کے باہمی تعلقات پر تفصیلی معلومات فراہمی کی ہیں۔''یہ دونوں ایک طرح کے Love Hate کے ازدواجی کیمپ میں اسیر ہو گئے تھے اور اس گرفتاری کے بعد انہیں ایک دوسرے کی عادت پڑ گئی تھی''۔ص۱۵۲

راشد صاحب کی فراست، تازہ ذہنی اور جذباتی شخصیت ایسی تھی کہ سطحی اور بے تہہ لوگوں ایسی کامیاب ازدواجی زندگی گزارنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ایک طرف پہلی بیوی کی منفعلانہ شخصیت تھی جوان کی بے قدری کا شکار ہوئی دوسری طرف شیلا کی کٹر، بند اور نیم جاہلانہ ذہنیت جس سے راشد صاحب آخری وقت تک برسرِ پیکار رہے۔ راشد صاحب گرو تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے علم وخیال کے خزانے سے شیلا بھی گاہے گاہے سیراب ہوتی رہیں مگر شیلا ایک کنزرویٹو استانی کی طرح اپنے دل اور ذہن کے سارے دروازے بند کیے بیٹھی رہیں اور اس بات پر کڑھتی رہیں کہ راشد صاحب پریکٹیکل آدمی نہیں تھے۔ص۱۵۱

جب دو مختلف شخصیتیں ایک دوسرے سے نامطمئن ہوں، تنہائی میں ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار ہونے لگیں اور کسی ہم دردانہ سمجھوتے سے قاصر رہیں تو اپنی بدترین صورتوں میں، بھری بزم میں ایک دوسرے کی بے عزتی کر کے اپنا انتقام لینے لگتی ہیں، یعنی تنہائی میں ایک دوسرے کی ہتک سے تسکین نہیں ہوتی بلکہ تماشائیوں کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ایک دوسرے سے بے اطمینانی بہت دنوں سے تھی مگر راشد صاحب کے آپریشن کے بعد، جب ڈاکٹر کے مشورے پر دونوں الگ الگ بستروں پر سونے لگے تو اور بھی ایک دوسرے کے دل سے دور ہو گئے۔ڈاکٹر نے عارضی نسخہ بتایا تھا مگر دونوں کو ایسا لطف آیا کہ یہ صورت مستقل ہو گئی۔یہی نہیں بستر تو الگ ہوئے ہی تھے، کمرے بھی الگ ہو گئے۔یہ رستگاری کی ایک ناکام کوشش تھی کہ تمام تر ذہنی بُعد کے باوجود جنسی ہم آہنگی ایسی تھی کہ آخری عمر میں بھی ہفتے میں دو بار شیلا کے کمرے میں مہمانی کرتے مگر یہ قیام آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے سے زیادہ نہ ہوتا۔وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔وہ وصال جسے ایک دوسرے کی ذات کے انکشاف کا مژدہ ہونا چاہیے تھا صرف جنسی سمجھوتا بن کر رہ گیا تھا۔ص۱۴۹-۱۵۰

۷۳۔ نسرین راشد، ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام، ص۴۷
۷۴۔ ساقی فاروقی، آپ بیتی/ پاپ بیتی، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۱۵۲
۷۵۔ نسیم عباس احمر، ن م راشد کے خطوط، ص۱۷۴
۷۶۔ خدیجہ اختر، پرایا مگر اپنا، مشمولہ: فن اور شخصیت، جانثار اختر نمبر، ص۴۹۷۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر:۲۰۱۳ء، ''ن م راشد شاعر اور شخص''، مکتبۂ دانیال، کراچی۔

۲۔ احمر، نسیم عباس:۲۰۰۸ء، ''ن م راشد کے خطوط''، پاکستان رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی، لاہور۔

۳۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر:۱۹۸۶ء، ''ن م راشد: ایک مطالعہ'' مکتبۂ اسلوب، کراچی۔

۴۔ جعفر احمد، سیّد، ڈاکٹر:۲۰۰۵ء، ''سجاد ظہیر شخصیت و فکر''، مکتبۂ دانیال، کراچی۔

۵۔ رضیہ سجاد:۱۹۵۱ء، ''نقوشِ زنداں''، مکتبۂ شاہراہ، دہلی۔

۶۔ ساقی فاروقی:۲۰۰۹ء، ''آپ بیتی / پاپ بیتی''، اکادمی بازیافت، کراچی۔

۷۔ صفیہ اختر:۱۹۶۷ء، ''زیرِ لب'' نیا ادارہ، لاہور۔

۸۔ صفیہ اختر:۱۹۷۳ء، ''حرف آشنا''، نیا ادارہ، لاہور۔

۹۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر:۲۰۰۸ء، ''ن م راشد: شخصیت اور فن''، اکادمی ادبیات اسلام آباد۔

۱۰۔ فیض، فیض احمد:۱۹۷۲ء، ''صلیبیں میرے دریچے میں'' مکتبۂ دانیال، کراچی۔

۱۱۔ فیض، فیض احمد:۱۹۹۷ء، ''نسخہ ہائے وفا''، فرید بک ڈپو، دہلی۔

۱۲۔ نسرین راشد:۲۰۱۰ء، ''ن م راشد کے خطوط اپنی اہلیہ کے نام''، اے آر پرنٹرز، اسلام آباد۔

۱۳۔ نوری، فخر الحق، ڈاکٹر:۲۰۱۰ء، ''مطالعہ راشد (چند نئے زاویے)''، مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد۔

۱۴۔ نعمانی، شبلی، مولانا: سن ندارد، ''معین احمد انصاری مکاتیب شبلی کی روشنی میں''، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی۔

رسائل:

۱۵۔ ''فن اور شخصیت'': جانثار اختر نمبر، شمارہ ۲، ۳، ۱۹۷۶ء۔

۱۶۔ ''نقوش'': مکاتیب نمبر جلد اوّل شمارہ ۶۵، ۶۶ نومبر ۱۹۵۷ء، لاہور۔